اسلامی تحریک دُوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل میں

نعیم صدیقی

ہر چند کہ موضوع ایک علمی و تحقیقی مقالے کا متقاضی تھا اور اس پر تیاری بھی ایک مقالے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کی جا رہی تھی، لیکن بعض وجوہ سے ناگزیر تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع میں اس موضوع پر تقریر ہی کی جائے۔ چنانچہ بہت سے مباحث کو بڑی شکل سے ڈیڑھ گھنٹے کی ایک تقریر میں سمویا گیا۔ وہی تقریر اب قلمبند کی جا رہی ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے کسی قدر اضافے کر دیے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ دورِ تہذیب[1] جس میں سے آج کی دنیا گذر رہی ہے تاریخِ انسانی کا سب سے نرالا دور ہے۔ یہ پہلا دورِ تاریخ ہے جس میں انسان نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کو خدا کے تصور سے، اس کی ہدایت سے، اس کے قانون سے اور الہامی اخلاق کی قیود سے آزاد کر کے خالص الحاد کی بنیادوں پر اپنی سیاست، معیشت، معاشرت، علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور بین الاقوامی تعلقات کو استوار کیا ہے۔ یہ دورِ تہذیب الحاد کے اصولوں کا ایک مکمل ہمہ گیر اور عالمگیر تجربہ ہے اور اتنا مکمل تجربہ ہے کہ آج یہ اپنے پورے نتائج ہماری آنکھوں کے

[1] یہ وضاحت شاید ضروری ہو کہ یہاں "دورِ تہذیب" کی اصطلاح ہیگل کے فلسفے کی مشہور اصطلاح "دورِ تاریخ" کے معنوں میں استعمال نہیں کی جا رہی۔ بلکہ یہاں دورِ تہذیب کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اجتماعی نظریۂ فکر و عمل افراد کے ذہنوں سے نکل کر قومی نظاموں کی شکل میں ڈھلا، پھر قوموں نے اسے فروغ دیا اور وہ عالمگیر پیمانے پر فروغ یافتہ ہوا اور آج حالت یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے علوم و فنون اور سیاسی و معاشی تنظیموں میں یہ سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس طرح کسی نظریے کے پھیل جانے کو ہم "دورِ تہذیب" کا نام دیتے ہیں۔

سامنے لئے کھڑا ہے۔

مجھے اپنی گفتگو کا آغاز اس دورِ تہذیب کے تذکرے سے اس لئے کرنا پڑا ہے کہ دنیا کی جن اہم ترین بین الاقوامی اجتماعی تحریکوں اور نظاموں سے اسلامی تحریک کا تقابل کرنا مطلوب ہے ان سب کا سرچشمہ یہی دورِ تہذیب ہے۔

دورِ متوسط سے یورپ کو جو چیز دورِ جدید میں لائی وہ دل و دماغ کی وہ تبدیلی تھی جسے ہم نشاۃ ثانیہ (Renaissance.) کے نام سے جانتے ہیں۔ سیاست میں بادشاہت، معیشت میں جاگیرداری اور علم و اخلاق اور نظامِ معاشرت میں کلیسائیت کے تسلط نے زندگی کو مغربی قوموں کے لئے ایک بوجھ بنا دیا تھا۔ لیکن اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے شعور کی جس حرکت اور جذبات کی جس کروٹ کی ضرورت تھی وہ اس وقت تک پیدا نہ ہو سکی جب تک کہ مسلم فاتحین فکر و احساس کی کچھ نئی لہریں اپنے جلو میں لئے ہوئے دنیائے مغرب میں داخل نہ ہوئے۔ یہ لوگ اپنے اصل مقام سے پسپا ہو جانے کے باوجود جس نئے نظامِ حیات کے علمبردار تھے وہ مسخ ہو کر بھی مذہبی عقائد میں تعقل، علوم و فنون میں تجربہ و تحقیق، سیاست میں ایک پاکیزہ جمہوریت اور معاشرت میں اخوت و مساوات کے گوناگوں عملی مظاہر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ چنانچہ مسلم فاتحین اگرچہ مغرب کو اپنے نظامِ حیات کا مومن نہ بنا سکے لیکن ان کو اور ان کی تاریخ کو انہوں نے شدید طور پر متاثر کیا۔ اسلام ہی حقیقی سبب بنا ہے نشاۃ ثانیہ کے ظہور کا، لیکن بہت سے اسباب تھے جن کے تحت تبدیلی کی یہ رَو آگے چل کر بالکل الحاد کی طرف مڑ گئی۔

نشاۃ ثانیہ کا ظہور اپنے ساتھ ایک شدید کشمکش کا پیغام لے کر آیا۔ عام انسان کے اندر بادشاہت، کلیسائیت، جاگیردار طبقے اور بورژوا طبقے کے خلاف ایک جذبۂ تنقید اور ایک ذوقِ احتجاج ابھرا۔ ان طاقتوں میں سے ہر ایک اپنے نامعقول حقوق اور ظالمانہ مفاد کو دانتوں سے پکڑ کے بیٹھ گئی اور اصلاح پذیری سے ہر ایک نے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری طرف مخالفت اور کشمکش کے جذبات اور بھڑکے۔ آہستہ آہستہ دونوں طرف انتہا پسندی پیدا ہو گئی۔ قدامت کے علمبرداروں نے ہر نئی افتاد کو کچلنا ضروری سمجھا، اور جدت کے علمبرداروں نے پہلے کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ ڈالنے کا فیصلہ

کرلیا۔ اس طرح پندرہویں سولھویں صدیوں کا دور جذباتی کشمکش اور توڑ پھوڑ کا ایک ایسا دور ہے جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اور اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیبِ الحاد کا دور شروع ہوا۔

تہذیبِ الحاد کے معماروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں اور انسانی فطرت کی کھلی کھلی پکار کو رد کر کے زندگی کی ساری عمارت کو اس فلسفے پر کھڑا کیا کہ یہ دنیا مادے کا کرشمہ ہے اور کسی خالق کے بنائے بغیر بنی ہے اور کسی حاکم و ناظم کے چلائے بغیر چل رہی ہے اور اس میں جو قوانین و نوامیس کارفرما ہیں وہ کسی قانون ساز کے منت کش نہیں ہیں۔ اس فلسفے کو سامنے رکھ کر جدید تہذیب کے بانیوں نے سارے ہی انسانی علوم کو خدا پرستی کی بنیادوں سے اکھیڑ کر انکارِ خدا کی بنیادوں پر استوار کرنے کی ایک لمبی مہم شروع کی۔ ہر تحقیق جس کا آغاز کیا گیا اس کی بسم اللہ اس مفروضے کو حقیقت مان کر کی گئی کہ کوئی خدا نہیں ہے، کوئی الہامی ہدایت نہیں ہے، کوئی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں ہے، کوئی حشر و نشر نہیں ہے اور کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ سائنس، علم النفس، بیالوجی، سیاست، اخلاق اور اجتماعیات اور دوسرے جن علوم پر بھی قلم اٹھایا گیا، یہ طے کر کے اٹھایا گیا کہ نظریۂ الحاد کو ایک حقیقت اور ایک امر واقعہ کی حیثیت سے منوانا ہے۔ اس طرح اس تہذیب کے لئے علمی بنیادیں فراہم کی گئیں اور پھر ان علمی بنیادوں پر اجتماعی تحریکوں اور اجتماعی نظاموں کی بنا رکھی گئی۔

انسان پہلے بھی حقیقت سے دور ہٹا ہے اور وہ پہلے بھی الٰہی ہدایت کی راہ سے بھٹکتا رہا ہے، مگر پوری تاریخِ انسانی میں وہ پہلی بار سوچ سمجھ کر اور بالکل علمی تیاریوں کے ساتھ اتنا بھٹکا ہے کہ اس نے قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبے کی تعمیر کو انکارِ خدا، انکارِ دین اور انکارِ اخلاق کی بنیادوں پر استوار کیا ہے ـــ اور پھر کسی ایک شہر میں نہیں، کسی ایک ملک میں نہیں، بلکہ پورے کے پورے براعظموں میں، بلکہ ساری کی ساری دنیا میں استوار کیا ہے! نظریۂ الحاد کو یہ فروغ پہلی مرتبہ حاصل ہوا ہے کہ اس کی بنیادوں پر ایک تہذیب برپا ہوئی اور وہ تہذیب بالآخر عالم گیر ہوگئی۔ اور آج وہ نظریۂ الحاد ایک دورِ تہذیب کی وسعتوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے جسے ہم "دورِ الحاد"

کا نام دیتے ہیں۔

تہذیبِ الحاد کے عناصرِ ترکیبی آگے چلنے سے پہلے یہ بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیبِ الحاد اور دورِ الحاد کے عناصرِ ترکیبی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے کہ جن کے گوناگوں مفاسد ہر اس تحریک میں اپنا کام کر رہے ہیں جو اس تہذیبِ الحاد کے بطن سے نمودار ہوئی ہے۔

اس تہذیب نے فکری اور ذہنی حرکت کا جو اصول اختیار کیا ہے وہ لبرلزم ہے۔ خلاصتہً اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب سوچنے کا آغاز کرے اور کسی معاملے میں رائے قائم کرنے لگے تو اسے چاہیئے کہ اپنی فکر کو ہر قسم کی پابندیوں سے، چاہے وہ مذہبی و اعتقادی ہوں یا اخلاقی و معاشرتی، پوری طرح آزاد کر لے۔ زندگی کے مسائل کو سوچتے ہوئے یہ ملحوظ رکھنا کہ مذہب نے ان مسائل میں کیا کہا ہے یا اخلاق کے تقاضے کیا ہیں، یا معاشرے نے اس کے بارے میں کیا حدود و قیود عائد کر رکھی ہیں، تاریک خیالی اور قدامت پسندی ہے جس کے ہوتے ترقی کرنا ممکن نہیں۔ اس لبرلزم کی عملی انتہا یہ تھی کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آتی ہو وہ چاہے اپنے اندر صداقت و افادیت کے کتنے ہی پہلو رکھتی ہو اسے بہرحال رد کر دینا اور اس کے مقابلے میں کوئی انوکھی بات تراش ڈالنا ہی اصل آزاد خیالی قرار پایا۔ فکری اور ذہنی حرکت کے اس اصول نے سب سے زیادہ شدت سے جس ماخذِ ہدایت کو نشانہ بنایا وہ دین و مذہب تھا۔ چنانچہ عقل تمام انسانی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانیت کی آلۂ کار بن گئی۔

تہذیبِ الحاد کا دوسرا عنصرِ ترکیبی مادیّت Materialism ہے۔ اس کا خلاصۂ مفہوم یہ ہے کہ مادّے سے ماوراء جو کچھ ہے انسان کو اس سے اور اس کو انسان سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان تو اپنا مقصود کسی کو اگر بنا سکتا ہے، اپنے لئے کوئی نصب العین اگر متعین کر سکتا ہے، اور اپنی جدوجہد کسی چیز پر صرف کر سکتا ہے تو وہ مادّی مفاد ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اگر سوچ سکتا ہے تو روپے پیسے کو سوچ سکتا ہے، روٹی کپڑے کو سوچ سکتا ہے، کھیتوں اور کارخانوں کو سوچ سکتا ہے، خام پیداواروں اور مصنوعات کی منڈیوں کو سوچ سکتا ہے ۔۔۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں کہ

جس پر وہ اپنا دماغ اور اپنی قوتیں صرف کرے۔ وہ اپنے فائدے اور اپنے نقصان کو اس دنیا کے بعد آنے والی کسی دنیا اور اُس کے حساب کتاب کو سامنے رکھ کر اگر طے کرتا ہے تو احمق ہے۔ اسے سارے فوائد اور سارے نقصانات کا تخمینہ اسی دنیا کو سامنے رکھ کر لگانا چاہیے اور اپنے ہر عمل کا حساب یہیں وصول کرنا چاہیے۔ اس کے لئے خیر و شر کی کسوٹی اگر کوئی ہے تو صرف یہ ہے کہ کن خیالات اور کن اعمال کی بدولت کوئی مادی فائدہ ملتا ہے یا کسی مادی نقصان سے بچنا ممکن ہے، اور کن کی بدولت کوئی مادی فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے یا کسی مادی نقصان کو سہنا پڑتا ہے۔

مادیت کے اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ اخلاق کے لئے نظریہ افادیت اختیار کرنا پڑا۔ یعنی نیکی کی تعریف یہ ٹھیری کہ ہر وہ حرکت جس سے کم سے کم تکلیف اٹھا کر زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کیا جا سکے اور جس کے نتیجے میں کسی طرح کا محسوس مادی فائدہ اور متعدد منافع حاصل ہو سکے وہ نیکی ہے اور ہر وہ بہتر سے بہتر اور پاکیزہ سے پاکیزہ انسانی خدمت کہ جس میں کوئی محسوس مادی نقصان پہنچتا ہو اور جس میں کوئی ایسی تکلیف پہنچتی ہو جو اپنے سے زائد آرام ادا نہ کرے وہ بدی ہے۔ اس طرح مادیت کے معیارِ خیر و شر اور افادیت کے بنائے اخلاق بن جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی ساری سرگرمیاں چند حیوانی خواہشات کے گرد گھوم گئیں۔

تہذیبِ الحاد کا چوتھا ترکیبی عنصر "حاکمیتِ جمہور" Sovereignty of the People کا تصور ہے جو جمہوری سیاسی انقلابات کی صورت میں برسرِ عمل آیا۔ لبرلزم نے جب قومی اور اجتماعی پیمانے پر کام کرنا شروع کیا تو اس نے حاکمیتِ جمہور کے نظریے کی شکل اختیار کی۔ حاکمیتِ جمہور کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آراء میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جس شئے کو کثرتِ آراء سے چاہیں اپنے لئے خود حرام یا حلال ٹھیرا سکتے ہیں۔ دین اور اخلاق کا کوئی اصول ایسا نہیں جو ان کی آراء اور ان کے فیصلوں اور ان کی خواہشوں کو پرکھنے والی کسوٹی بن سکے، بلکہ جمہور کی آراء اور ان کے فیصلے اور ان کی خواہشیں وہ اصل کسوٹی ہیں کہ جسے چاہیں حق قرار دیں اور جسے چاہیں باطل ٹھیرائیں، جسے چاہیں اپنا دین بنالیں اور جسے چاہیں رد کر دیں۔ ان کی خواہشات سے

بالاتر کوئی اقتدار نہیں ہے۔ وہ اپنے اندر آخری اتھارٹی رکھتے ہیں۔ چنانچہ حاکمیت جمہور کے اس تصور نے خواہش کی بندگی اور مادہ پرستی کے راستے بالکل ہموار کر دیے۔

سیاست کے بعد معیشت کے میدان میں تہذیب الحاد کو جو مزاج ملا ہے وہ صنعتی انقلاب کا منطقی نتیجہ ہے۔ صنعتی انقلاب جب آیا ہے اور معیشت جاگیردارانہ نظام کی بنیادوں سے جب اکھڑی ہے تو عوام ایک عجیب صورتِ حالات سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کا حال بالکل ایسا ہو گیا کہ جیسے وہ ایک طوفانی سمندر کے حوالے کر دیے گئے ہیں اور ہر ایک اپنے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ چند سبکسارانِ ساحل کو چھوڑ کر، جو اس طوفان کی تباہ کاریوں سے بے نیاز انجمن آرا رہتے، باقی لوگوں کے لئے روٹی کے چند نوالے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن گئے۔ اس ظالم صنعتی انقلاب نے جب بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے مشینیں چلوائیں اور مشینوں کی کثیر پیداآوری اور زود پیداآوری نے جب ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگروں کو ہزاروں کی تعداد میں بے روزگار کرنا شروع کیا تو انسان کی ساری سرگرمیوں کا محور اس کا پیٹ بن کر رہ گیا۔ پھر صنعتی انقلاب کا لایا ہوا یہ معاشی انتشار تنہا نہیں آیا بلکہ اپنے ساتھ خاندانی نظام کی تباہی کا پیغام بھی لایا۔ جب زراعت کو صنعت نے پسپا کیا تو لوگ دیہات سے اکھڑ کر شہروں میں جمع ہونے لگے، اور جب بے روزگاری نے نقل مقام کی ایک عام ضرورت پیدا کر دی، اور جب محنت کے پست معاوضوں نے شہری مصارف کا بوجھ اتنا بڑھا دیا کہ گھروں نے عورت کو باہر دھکیل دیا تو خاندان کے اہم ترین تہذیبی ادارے کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ اس طرح معاشی انتشار کے ساتھ جب معاشرتی انتشار کی لہریں بھی آ کے مل گئیں تو اس سیلاب نے اخلاق اور مذہبی تصورات کی چولیں ہلا ڈالیں۔ یوں صنعتی انقلاب نے انسان کو روٹی کی خاطر انسانیت کی ہر قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کرنا سکھایا اور روپیہ پیسہ اور زندگی کی مادّی ضروریات آخری مقصود بن کر رہ گئیں۔ پھر صنعتی انقلاب کا ایک اثر یہ بھی پڑا کہ انسان کے متعلق ایک خاص مشینی تصور فروغ پانے لگا اور اس کی عضویاتی زندگی کی طرح اس کی نفسیاتی اور اخلاقی زندگی کی بھی ایک میکنیکل تشریح کی جانے لگی اور اس تشریح کے فریم میں زندگی کی روحانی قدروں کی کوئی کھپت سرے سے

تھی ہی نہیں۔

اس طرح صنعتی انقلاب نے اس تہذیب کا مزاج بنانے میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کے گہرے اور رگ رگ میں اترے ہوئے اثرات اس تہذیب کے ہر شعبے اور اس کی ہر تحریک میں آج بھی کارفرما ہیں۔

پھر اس تہذیبِ الحاد کا ایک بڑا عنصر حیوانی ازدواج کا فلسفہ و نظام ہے جس نے اخلاقی قدروں کی تباہی اور نظامِ تمدن کے فسادِ مزاج کی تکمیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صنعتی انقلاب جب عورت کو گھر سے اغوا کر کے باہر لے آیا اور اس سے اضطراب پیدا ہوا تو ہوشیار فلسفی آگے بڑھے اور انہوں نے مساواتِ مرد و زن کا ایک من گھڑت فلسفہ پورے زور سے پھیلانا شروع کیا۔ انہوں نے تسلی دلائی کہ عورت کا اصل مقام ہی یہ ہے کہ وہ مرد کے پہلو بہ پہلو ہر کام میں مسابقت کرے اور اور معاشی حیثیت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ جب طلاق کی کثرت، کنوارپن کی کثرت اور زنا کی کثرت کے روپ میں نمودار ہوا تو ترقی پسند فلسفہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اطمینان دلایا کہ آزاد محبت اور صنفی انارکی تو عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں تو مصنوعی اور محض تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ پھر جب صنفی ذواقی کے لئے بچوں کی پیدائش سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا برداشت کرنا مشکل ثابت ہونے لگا تو اسی فلسفے نے آگے بڑھ کر برتھ کنٹرول کا سبق پڑھایا اور اس میں بڑی بھاری تمدنی و معاشی مصلحتیں نمایاں کر کے دکھائیں۔ لیکن اس کے بعد بھی چونکہ توالد و تناسل کا دروازہ پوری طرح بند نہ ہو سکا اور "حرام اولاد" ایک مستقل مسئلہ بن گئی تو فلسفہ پھر سامنے آیا اور اس نے "حرام اولاد" کو جائز اولاد کے برابر ثابت کرنے اور ہر قسم کی مادریت کو ایک ہی درجہ دینے کے لئے پورا زورِ استدلال صرف کر ڈالا۔ اس طرح حیوانی ازدواج کا نظریہ میدانِ عمل میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا اور سوسائٹی میں ذواقی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس ہمہ گیر معاشرتی فساد نے انسانی اخلاق کی ساری قدروں پر بُری طرح جھاڑو پھیر دی۔

موجودہ تہذیبِ الحاد کا انتہائی زہریلا عنصر نیشنلزم ہے۔ قرونِ متوسطہ میں یورپ کے انسان

کے لئے کلیسا ایک قوتِ محرکہ کا کام دیتا تھا، لیکن جب اس کا شیرازہ درہم برہم کر دیا گیا اور دلوں اور دماغوں سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو ایک بڑا نازک سوال یہ نمودار ہو گیا کہ کلیسائی جوڑ کے کھل جانے کے بعد اب چھوٹی چھوٹی قوموں اور ملکوں میں بٹے ہوئے یورپ کے لئے قوتِ محرکہ کیا ہو جو اسے ترقی کی طرف بڑھنے اور مشکلات سے لڑنے پر اکساتی رہے اور جس کے نام پر اس کے جذبات میں گرمی پیدا کی جا سکے۔ اس کے جواب میں تہذیبِ الحاد نیشنلزم کی روح کو سامنے لائی۔ خدا کے انکار کے بعد انسانی زندگی میں ایک خلا واقع ہو جاتا ہے کہ وہ آخر کس کے نام سے تحریک حاصل کرے، اور کس کے لئے جیے اور مرے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے نیشنلزم نے فرد فرد میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم اور تمہاری ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔ اس بت کے استھان پر تم کو اپنا سب کچھ بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ تمہارے سارے اجتماعی عزائم، تمہارے سارے اخلاق، تمہارے سارے اونچے آئیڈیل "خداوند قومیت" کے تابع ہونے چاہئیں۔ تمہاری زندگی کا ہدف یہ ہونا چاہیئے کہ تم اپنی کوششوں سے قوم کے خزانۂ معیشت میں، اس کے علوم و فنون کے سرچشموں میں، اسکے مقبوضات اور اس کی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر کے رخصت ہو۔ تمہاری قوم کے لئے جو چیز مادی لحاظ سے مفید ہو وہ چاہے دین و اخلاق کے لحاظ سے کتنی ہی بڑی ظالمانہ کارروائی چاہتی ہو، اسے کر گذرو، اور تمہاری قوم کے لئے جو چیز مادی لحاظ سے مضر پڑے وہ دین و اخلاق کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا فریضہ کیوں نہ ہو اس سے پرہیز کرو۔ تمہیں اپنی قوم کی ترقی کے لئے دوسری قوموں کی آزادی پر اگر ڈاکے ڈالنے پڑیں اور اگر دوسروں کے واضح ترین حقوق کا قتلِ عام کرنا پڑے، تو یہ سب کچھ کر گزرو۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ تمہاری قوم اگر حق پر ہو تو بھی تم اس کا ساتھ دو، اور اگر وہ جھوٹ پر ہو تو بھی تم اس کے جھوٹ کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے پوری طرح وقف رہو۔

نیشنلزم کے اس نظریہ کے اندر فساد کے جو بیج دبے ہوئے تھے وہ جب چیرہ دستیوں، وعدہ خلافیوں، کمزور آزاریوں اور جنگوں اور تصادموں اور چالبازیوں کی شکل میں اُگے اور اپنا پھل لانے لگے تو مغرب کی قوموں نے اس کے مفاسد کی روک تھام کے لئے لیگ آف نیشنز کی بنا رکھی۔ لیکن

خدا کے انکار سے جو خلاء اجتماعی زندگی میں واقع ہوگیا تھا اسے لیگ آف نیشنز پُر کرنے میں ناکام ہوگئی اور نوعمری میں ہی اسکی تجہیز و تکفین کا سامان کرنا پڑا۔ اب پھر اس خلاء کو پُر کرنے اور نیشنلزم کے مفاسد سے نجات پانے کے لئے ادارہ اقوامِ متحدہ کو کھڑا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی ناکامی بھی اوّل قدم پر معلوم ہے۔

تہذیبِ الحاد کے ان سارے عناصر نے انسانیت کے اچھے احساسات اور اخلاق کی قیمتی قدروں کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر کام نظریۂ ارتقاء نے کیا۔ یہاں میں اس نظریے کے حیوانیاتی (Biological) پہلو پر کوئی بحث کئے بغیر اس کے دوسرے پہلو یعنی معاشرتی پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ خالص حیوانی تصورات کی بنیادوں پر جو تہذیب مغرب میں ارتقاء کرنے لگی تھی اس کے متعلق دلوں اور ضمیروں کا اطمینان پوری طرح اس وقت تک پیدا نہیں ہوا اور اخلاق باختگی کے جو مظاہر اس نے لوگوں کے سامنے رکھے اس پر طبیعتیں اس وقت تک ٹھکنے نہیں پائیں جب تک کہ معاشرتی ارتقاء کا نظریہ فضا میں پوری طرح پھیل نہیں گیا۔ اس نظریے نے ظلم، مکر و فریب، کشمکش، تصادم، بے حیائی، شکم پرستی اور دوسرے تمام حیوانی اوصاف کو جو چاروں طرف فروغ پا رہے تھے عقلی اور اخلاقی جواز کی سند عطا کی ہے۔ اس نظریے نے زندگی کا بنیادی فلسفہ یہ سامنے رکھا کہ کائنات، اور خود انسانی تاریخ ایک میدانِ جنگ ہے اور فطرت نے پورا انتظام ایسے اصولوں پر استوار کیا ہے کہ زندگی کا تقاضا ہی جنگ اور تصادم اور کشمکش اور قوت آزمائی ہے۔ یہاں اگر قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو حق یہی ہے کہ وہ ایسا کرے اور یہاں اگر کوئی کمزور ظلم سہتا ہے اور قوت کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو فطرۃً وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک ہو۔ یہ سب کچھ مشیت کی بے رحم جبریّت کے تحت ہو رہا ہے، لہٰذا یہاں کوئی اخلاقی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کشمکش ناگزیر ہے اور یہ بھی ناگزیر ہے کہ ترقی کرنے والا اپنی قوت کو کمزوروں کے خلاف استعمال کر کے ان سے فائدے اٹھا کر ترقی کرے۔ اس فلسفے نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ فرد اور فرد کے درمیان تعاون اور ایثار اور

ہمدردی کے تعلقات کی ساری ڈوریاں کاٹ دی ہوں اور طبقوں اور طبقوں کے درمیان اس نے توافق کے امکانات کا خاتمہ کر دیا ہو، بلکہ یہی نظریہ ہے کہ جس نے سرمایہ داری اور امپیریلزم کو پاؤں رکھنے کے لئے عقلی زمین فراہم کر کے دی ہے اور یہی ہے کہ جو کمزور قوموں پر جدید طاقتور قوموں کی چیرہ دستی کو عین حق ثابت کرنے والا منطق ہے۔

تہذیبِ الحاد کی ناکامی

حضرات! یہ وہ عناصر ہیں کہ جن سے دورِ حاضر کی تہذیبِ الحاد نے ترکیب پائی ہے۔ ان عناصر اور اس ترکیبِ مزاج کو سامنے رکھ کر بڑی اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی تہذیب سے انسانیت کو کیا پھل مل سکتے ہیں۔ لیکن انسان نے اس کے عناصرِ ترکیبی اور اس کے مزاج سے قطع نظر کر کے بالکل برعکس قسم کی امیدیں اس سے قائم کی ہیں۔ اس نے اس تہذیب کو اختیار کرتے ہوئے امن اور سکون کی جنت کے سنہرے خواب دیکھے ہیں۔ مگر آج دو تین صدیوں کے طویل تجربے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سارے خواب پریشان ہو چکے ہیں۔

غور فرمائیے کہ اس تہذیب کے زیر اثر علوم و فنون کے کتنے دریا بہائے گئے ہیں، کتنا لٹریچر ہے جو پیدا کیا گیا ہے، ادب و صحافت کی دنیا میں کتنا سرمایۂ محنت ہے جو انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا ہے، زرعی اور صنعتی پیداواروں میں کتنا بڑا اضافہ ہوا ہے، انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کتنی گوناگوں ایجادات ہیں کہ جو وجود میں آئی ہیں، فطرت کی کتنی قوتیں ہیں کہ جن کو مسخر کر لیا گیا ہے، کتنے دوررس اور ہمہ گیر وسائل ہیں کہ جن پر انسان کو قابو حاصل ہوا ہے، پھر کتنے ہی اجتماعی نظام، کتنے ہی ادارے، حکومتوں کے کتنے ہی ڈھانچے اور ربط و تنظیم کے کتنے ہی نمونے ہیں کہ جن کو اس تہذیب نے فراہم کیا ہے۔ یہ سب کچھ گراں بہا دماغی محنتوں کا، مالی مصارف کا، جسمانی مشقتوں کا اور جانی قربانیوں کا حاصل ہے۔ اس کے لئے انسان خونی انقلابوں سے گذرا ہے، اس کے لئے اس نے لڑائیوں کا سامنا کیا ہے، اس کے لئے وہ خاک و خون میں لوٹا ہے، اس کے لئے اس نے قربانیوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔

مگر آپ ساری دنیا کا، اس کی ہر قوم کا، اور ایک ایک بستی کا اور ایک ایک فرد کا جائزہ لے کر

دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ انسانیت آج بھی دکھی ہے، پہلے سے زیادہ دکھی ہے اور یہ سارے سروسامان اس کی گرہوں کی عقدہ کشائی نہیں کر سکے۔ اتنی پیداواریں ہیں مگر انسان پھر بھی بھوکا ہے، اتنا سامانِ دفاع ہے مگر انسان پھر بھی خوف زدہ ہے، اتنے علوم کے سرچشمے جاری ہیں مگر انسان پھر بھی جاہل ہے، اتنے ذرائع و وسائل کام کر رہے ہیں مگر انسان پھر بھی اطمینان سے محروم ہے۔ اس نے جس جنت کے لئے تین چار صدیوں کا جاں کاہ سفر طے کیا ہے وہ پہلے سے زیادہ ہی دور ہو گئی ہے۔

انسانی تاریخ کا جہاں یہ سب سے بڑا تجربہ اور سب سے عجیب تجربہ ہے کہ انسان نے خدا اور اس کی ہدایت سے پوری طرح آزاد ہو کر زندگی کے تمام کے تمام شعبوں کو اپنی خواہشوں پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں یہ دنیا کا سب سے زیادہ ناکام اور سب سے زیادہ دردناک تجربہ بھی ہے۔ جس دن انسان اپنے اس سارے کارنامے کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیگا اس دن وہ پشیمانی سے خون کے آنسو روئے گا۔

اب میں اُن اجتماعی تحریکوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو اس دورِ تہذیب کے سائے میں پروان چڑھی ہیں اور جن سے ہمیں سابقہ درپیش ہے۔ ان تحریکوں کے متعلق جو کچھ میں عرض کروں گا اس کے دوران میں یہ بات آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے کہ یہ ساری تحریکیں جس مادرِ تہذیب کا دودھ پی کر پلی ہیں اس کے مزاج، اس کے اوصاف، اس کے عناصرِ ترکیبی اور اسکی سیرت کا پورا پورا اثر اُن کی رگوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اپنی بنیادی فکر کے لحاظ سے اُن میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ یہ سب کی سب اُن عناصر کو ساتھ لئے ہوئے ہیں جن سے ان کی مادرِ محترم وجود میں آئی تھیں۔

۱۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت

تہذیبِ الحاد کے بطن سے جو پہلی اجتماعی تحریک نمودار ہوئی وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ بدقسمتی سے یورپ میں جب نیا دور ابھرا تو اس کی سربراہ کاری بورژوا طاقتوں کے ہاتھ

میں آگئی۔ بادشاہیت، کلیسائیت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ساری جنگ تو عوام نے لڑی اور اس جنگ میں ہر طبقہ یکساں شریک جدوجہد رہا، مگر اس جنگ کا سارا مالِ غنیمت بورژوا طبقہ لوٹ لے گیا۔ صنعتی انقلاب اور جمہوری انقلاب، دونوں کے دونوں نے قربانیاں تو عوام سے وصول کیں، لیکن ان دونوں کا پھل بورژوا طبقہ کی جھولی میں جا پڑا۔ بورژوا طبقہ کی اس سربراہ کاری اور اجتماعی فوقیت کی وجہ سے تبدیلی نے جو شکل اختیار کی وہ تھی سرمایہ دارانہ جمہوریت!

سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حقیقت کا جب بھی تجزیہ کیا جائے گا تو ناگزیر ہے کہ اس کے سیاسی اور معاشی دونوں پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے۔ پس ہم پہلے اس تحریک کے سیاسی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں

جمہوریت کا جائزہ لینے کے لئے یہ پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس نظام کا اصل جوہر کیا ہے۔ ایک جمہوری نظام اگر اپنے اندر کوئی افادیت رکھتا ہے تو وہ صرف اس صورت میں موجود رہتی ہے جب کہ اس کا اصل جوہر محفوظ ہو۔ جمہوریت کا اصل جوہر یہ ہے کہ ایک تو حکومت عوام کی معتمد علیہ ہو، کارپردازانِ حکومت عوام کے حقیقی نمائندے ہوں، جب تک رائے عام کی حمایت ان کو حاصل رہے وہ مناصب پر قائم رہیں اور جب عوام کا اعتماد وہ کھو بیٹھیں وہ فوراً سبکدوش ہو جائیں۔ دوسرے یہ ضروری ہے کہ حکومت، قانون، نظم ونسق اور داخلی اور بین الاقوامی پالیسی میں کوئی چھوٹی یا بڑی تبدیلی لانے کے لئے یہ بات کافی ہو کہ رائے عام اس تبدیلی کی حمایت کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پرامن طریق سے ہر تبدیلی کے آنے کے لئے دروازے کھلے رہیں۔ یہی وہ جوہر ہے کہ جس کی بنا پر جمہوریت کے علمبردار انسانیت کو اپیل کرتے ہیں۔

یہ جوہر جب تک کسی نظام میں محفوظ ہو وہ ایک جمہوری نظام ہے اور انسانی ترقی کے لئے اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ جوہر کسی طریقہ سے ضائع کر دیا جائے اور نظام کی دستوری ساخت ایسی ہو، یا اس کے عملی طریق کار میں ایسے خلل موجود ہوں کہ یہ جوہر کام نہ کر سکے، تو پھر چاہے ایک نظام کا ظاہری ڈھانچہ کتنا ہی جمہوریت نما کیوں نہ ہو، دستور میں کیسی

ہی مرعوب کن دفعات کیوں نہ موجود ہوں، اور پارلیمنٹ اور اس کے انتخابات کا ڈرامہ کتنے ہی خوشنما طریقے سے کیوں نہ کھیلا جاتا رہے، جمہوریت جمہوریت نہیں رہتی اور اس سے جن فوائد کی توقع کی جا سکتی ہے ان میں سے کوئی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت ذہن نشین رکھتے ہوئے اب ہم مغرب کی اُس الحادی جمہوریت پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں جو بورژوا طبقے کی سربراہ کاری میں ایک خاص شکل کے ساتھ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں کارفرما ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک جمہوری نظاموں کے باہر کے ڈھانچوں کا تعلق ہے وہ بڑے مرعوب کن ہیں، لیکن ان خوشنما ڈھانچوں کے اندر کہیں بھی جمہوریت کے حقیقی جوہر کو بر سرِ عمل آنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جمہوریت کے قبلوں — امریکہ و برطانیہ — میں بھی جمہوریت کا سارا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے لیکن جمہوریت کے جوہر کو کام نہیں کرنے دیا جاتا۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کے مفاسد میں اپنی تقریر میں اُن مفاسد کے متعلق بہت ہی مجمل سے اشارات کروں گا جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کا اصل جوہر جمہوریت برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

جمہوری نظاموں میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانے میں اوّلین اور سب سے بھاری رکاوٹ دستور کی رکاوٹ ہوتی ہے۔ کسی بھی جمہوری نظام کو اٹھا کر دیکھئے تو اس کا ابتدائیہ، اس کے اصول اور اس کی دفعات کھلی کھلی شہادتیں دیں گی کہ وہ ایک خاص طبقے کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہے اور اس طبقے نے پوری کوشش کی ہے کہ آئندہ نسلوں کو اپنے تجویز کردہ دستور کے بنیادی اصولوں کا اچھی طرح پابند کر لیا جائے اور حتی الامکان اُن میں تبدیلی کو زیادہ سے زیادہ دشوار کر کے رکھ دے۔

پھر دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ رائے عام کے بنانے میں جن ذرائع و وسائل سے کام لیا جاتا ہے وہ سارے کے سارے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہیں۔ خصوصیت سے پریس کی طاقت جو رائے عام پر کمانڈ کرتی ہے ایک ہی طبقے کے چند گنے چُنے افراد کے قابو میں ہے اور وہ اس طاقت کے ذریعے رائے عام کے بہاؤ کو اپنے طبقے کے مفاد کے خلاف کبھی جانے نہیں دیتے۔ قوم کی قوم کو چند افراد حالات کا ایک خاص رنگین عینک سے مطالعہ کراتے ہیں، ان کو ایک زاویۂ نظر دیتے

ہیں، ان کے سامنے ایک خاص طرزِ فکر کو ابھار ابھار کر لاتے ہیں اور ان کے بعض رجحانات کو خاص طور پر غیر اہم بنا بنا کر پیچھے دھکیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پریس انتخابات کے زمانے میں ذہنی فضا کو اتنا مکدر کر دیتا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کر سکتیں اور رائے عام کا بہاؤ خالص جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب ووٹروں کے فکر کے جہاز بے لنگر ہو جاتے ہیں تو پروپیگنڈے کی ہوا ان کو جدھر چاہتی ہے دھکیل کر لے جاتی ہے۔

پھر جمہوریت کا جوہر آزادیٔ انتخاب اور آزادیٔ رائے دہی کا متقاضی ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی جمہوری نظام ایسا نہیں کہ جہاں ووٹرں کی آزادیٔ انتخاب صحیح معنوں میں کام کر سکے۔ آزادیٔ انتخاب کی جڑ تو امیدواری کا اصول اوّل قدم پر کاٹ دیتا ہے۔ چنانچہ امریکہ جیسے قبلۂ جمہوریت کا حال یہ ہے کہ وہاں کے نیگرو کو کاغذ پر تو ویسا ہی حق رائے دہی حاصل ہے جیسا ایک سفید فام باشندے کو، لیکن پچاس سال کے عرصے میں صرف ایک نیگرو کانگریس کا ممبر منتخب ہو سکا۔ پھر وہاں ووٹروں پر پول ٹیکس لگا کر ان کے حق رائے دہی کی جیب تراشی کی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۸ء تک برابر اس ٹیکس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس قسم کی پابندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء[1] میں ریاست (Tennessyee) کے گورنر کا انتخاب ہوا تو ۱۲ لاکھ ووٹروں میں سے صرف ۳ لاکھ ۵۲ ہزار نے ووٹ ڈالے۔ مختلف ممالک میں عوام کے حق رائے دہی پر اس طرح کی مختلف پابندیاں عائد ہیں۔

پھر بات اتنی ہی نہیں بلکہ ووٹوں کے باقاعدے سودے ہوتے ہیں اور انتخاب کی منڈی کے بعض "ہول سیل ڈیلر" تو بہت بڑے پیمانوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ جی ہاں پاکستان ہی میں نہیں برطانیہ

---

[1] ریاست ٹینیس سی کے جس انتخاب کا اوپر ذکر ہوا ہے اس میں ایک شخص "ایڈورڈ ہل کرمپ" کے متعلق یونائیٹڈ پریس کے نمائندے کا بیان یہ ہے کہ تنہا یہ شخص ریاست کی قسمت پر حکمران ہے اور ایک مرتبہ یہ اپنا ٹیلیفون اٹھا کر اپنے زیر اثر ۶۰۰۰۰ ہزار ووٹروں کے بل پر جس سے سودا چکا لے وہ ریاست کا گورنر ہوگا۔

اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی یہ کاروبار ہوتا ہے ۔ مروّت کی قیمت پر بھی ہوتا ہے، روپے کی قیمت پر بھی ہوتا ہے، اور عورتوں کے حسن وجمال کی قیمت پر بھی ہوتا ہے ۔ اپنی پارٹی کے حامیوں اور ووٹروں کو امیدوار سب سے بڑا لالچ جو دیتے ہیں وہ حکومت کے انتظامی عہدوں کا لالچ اور سرکاری محکموں سے مختلف کام نکالنے کی آسانیوں کا لالچ ہوتا ہے ۔ علاوہ بریں انتخابی پارٹیاں اور عام امیدوار کامیاب ہونے کے لئے عوام کے ووٹ اس قیمت پر حاصل کرتے ہیں کہ وہ برسر اقتدار آکر ان کی کچھ خواہشات پوری کریں گے — قطع نظر اس کے کہ ان خواہشات کا پورا کرنا ملک کے مجموعی مفاد کے لئے کتنا ہی مہلک کیوں نہ ہو ۔

یہ انتخابی کاروبار ووٹروں کی آزادیٔ رائے کا درحقیقت خاتمہ کر دیتا ہے ۔

علاوہ بریں برطانوی نظام انتخابات کے بارے میں خود برطانوی لبرل پارٹی کا مشہور رہنما رمزے میور (Ramsay Muir) اپنی رائے دیتے ہوئے اس کو "انتہائی غیر منصفانہ، غیر اطمینان بخش اور خطرناک" قرار دیتا ہے ۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے کہ کتنے ووٹ اس لئے ڈالے نہیں جاتے کہ بہت سے ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار موجود نہیں ہوتا، اور کتنے ووٹ ایک معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بلا کے مقابلے میں "چھوٹی بلا" کے اصول پر نااہل لوگوں کو دے دیئے جاتے ہیں، اور کتنے ووٹ ناکام امیدوار کو دیئے جانے کی وجہ سے بلحاظ نتیجہ ضائع جاتے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ ستر فیصدی رائے دہندگان حالات پر اثر انداز ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ملک کا نظام صرف تیس فیصدی ووٹروں کی مرضی پر چلتا ہے ۔ مثلاً ۱۹۴۵ء کے برطانوی انتخابات میں ۸۰ لاکھ ووٹروں میں سے ۲۵ فیصدی نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے، اور اسی طرح امریکہ کے ۱۹۴۸ء کے انتخابات میں ووٹ کا حق استعمال کرنے والے ووٹر صرف ۳۹ فیصد تھے ۔

مشکل اتنی ہی نہیں، مشکل یہ بھی ہے کہ پارٹی سسٹم پر جمہوری نظام کے چلنے کی وجہ سے لوگوں کی وہ اکثریت جو نہ تو اپنے تقاضوں کے مطابق کوئی پارٹی میدان میں پاتی ہے اور نہ پارٹی بنانے

کے لئے نمایاں شخصیتیں اور صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل رکھتی ہے، اسے مجبوراً با اثر اور نمایاں پارٹیوں کے ساتھ مصالحت کر کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح عوام کے بہت سے حقیقی رجحانات جمہوری نظاموں میں اپنے لئے کوئی راستہ ہی نہیں پا سکتے

اسلام

دوسرے نظام ہائے حیات کے مقابلے میں ایک زیادہ صالح اور انسانیت کے لیے زیادہ مفید نظام حیات رکھتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے

- اسلام کا نظام حیات
- اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر
- اسلامی نظام کس طرح قائم ہوتا ہے
- اشتراکیت اور نظام اسلام
- خطبات
- الجہاد فی الاسلام
- اسلامی قانون
- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
- اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر
- اسلام کا نظریہ سیاسی
- مسئلہ ملکیت زمین

مطالعہ کریں

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔ اچھرہ، لاہور